۸۶

حبیب کیفوی

امین حزیں — خواجہ عبدالمسیح پال

ادب نواز کہا کرتے ہیں امینِ حزیں   مگر عوام محمد مسیح پال مجھے

خواجہ عبدالمسیح پال ۱۸۸۴ میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے ۔ وہ سیالکوٹ کے ایک مشہور مذہبی خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں ۔ ان کے والد بزرگوار مولوی احمد الدین مرحوم بڑے متدین اور پرہیزگار بزرگ تھے اور مولوی ابراہیم مرحوم سیالکوٹی سے قرابتِ قریبہ رکھتے تھے ۔ ان کے بزرگوں نے کسی زمانے میں کشمیر سے ہجرت کی تھی اور یہ سانحہ بہت سے کشمیری خاندانوں کو پیش آیا جنھوں نے حالات سے مجبور ہو کر صبحِ وطن پر شامِ غربت کو ترجیح دی ۔

آپ نے تعلیم سیالکوٹ میں مکمل کی ۔ شروع میں علامہ اقبالؒ کے استاد شمس العلما مولوی میر حسن مرحوم سے فیض اٹھایا ۔ علامہ اقبال سے ہم وطنی کی وجہ سے مراسم تھے اور ان کے کلام سے بھی بے حد متاثر تھے ۔ انھیں علامہ اقبال کا اندازِ سخن اتنا پسند تھا کہ انھوں نے علامہ سے اصلاحِ سخن کی خواہش کی ۔ چونکہ علامہ عام طور پر اصلاح دینے سے گریز کرتے تھے اس لیے انھوں نے یہ بات تو نہ مانی البتہ مشورہ دیا کہ وہ اساتذہ کا کلام دیکھتے رہیں اور مشقِ سخن جاری رکھیں ۔ اس سے مراسم میں کوئی فرق نہ آیا ۔ بعد میں کثرتِ مطالعہ اور فطری ذوقِ شعر کی بدولت شاعری میں اپنے لیے خاص مقام پیدا کر لیا ۔ امین حزیں مولانا ظفر علی خاں کی شاعری سے بھی بڑے متاثر تھے ۔ ان کا کلام حکمت و معارف کا گنجینہ ہے ۔ اس میں شگفتگی ہے ، پختگی اور رنگینی کے علاوہ فلسفیانہ موشگافیاں بھی ہیں ۔ ان خوبیوں کے ساتھ قومی درد سے بھی لبریز ہے ۔ ان کا مجموعۂ کلام ’’گلبانگِ حیات‘‘ کے نام سے چھپ چکا ہے ۔

جس سر زمین سے ان کے بزرگوں کا تعلق تھا ان کی زندگی کا بیشتر حصہ اسی سر زمین میں بسر ہوا اور ان کی شاعری کا عروج بھی اسی خطۂ گل پوش میں ہوا ۔ کشمیر ریذیڈنسی میں وہ ایک اچھے منصب پر فائز تھے اور اس تعلق کی وجہ سے وہ کشمیر اور گلگت میں تیس برس سے زائد عرصہ مقیم رہے ۔ طویل ملازمت اور حسن خدمت کے صلے میں حکومت برطانیہ سے انہیں خطاب و اعزاز بھی ملا ۔ ملازمت سے سبک دوش ہو کر سیالکوٹ آ گئے جہاں وہ بڑے انہاک سے اپنے ذوق کی تسکین اور علم و ادب کی خدمت میں مصروف رہے ۔

۱۹۴۸ میں امین حزیں صاحب سے ان کے برادر اصغر اثر صہبائی مرحوم کے ہمراہ پہلی ملاقات ہوئی تھی ۔ دوسری بار دسمبر ۱۹۵۶ میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا ۔ مکان پر پہنچ کر دروازے پر دستک دی تو ملازم نے دروازہ کھولا ۔ اسے بتایا کہ امین حزیں صاحب سے ملنا ہے ۔ ملازم نے نام پتا پوچھ کر اندر اطلاع دی اور واپس آ کر ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے لیے کہا ۔ پانسات منٹ کے بعد امین حزیں تشریف لائے ۔ میں تعظیماً کھڑا ہوگیا ۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ملایا ، لیکن ضعف بصارت کی وجہ سے پہچان نہ سکے ۔ صوفے پر بیٹھ گئے اور میں ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا اور مزاج پرسی کی ۔ میں نے دیکھا وہ بڑے نحیف ہو چکے تھے ۔ بینائی اور توانائی میں فرق آ چکا تھا ۔ ۱۹۴۸ میں انہیں دیکھا تو ان کی صحت غیر معمولی تھی اور چست و توانا تھے ۔ سرخ و سفید رنگ کی وجہ سے بالکل یورپین نظر آتے تھے ۔ اب جو دیکھا تو زمین و آسمان کا فرق پایا ۔ البتہ یہ سن کر خوشی ہوئی کہ اب بھی لکھنے پڑھنے اور غور و فکر میں مصروف رہتے ہیں ۔ گو حافظہ پہلے سا نہیں رہا اور اس کی انہوں نے شکایت بھی کی ۔ دوبارہ میرا نام پوچھا تو اور بھی تپاک اور گرم جوشی سے پیش آئے ، کیونکہ ''نوائے وقت'' اور دوسرے روز ناموں میں کشمیر سے متعلق میرے متعدد مضامین ان کی نظر سے گزر چکے تھے اور اس کا ذکر بھی خود انہوں نے کیا ۔ اس تعارف کے بعد انہیں اطمینان ہو گیا کہ ان کا واسطہ کسی غلط قسم کے آدمی سے نہیں ہوا اور ان کا قیمتی وقت ضائع نہیں جائے گا ۔ وہ اب نقاہت و ضعف بصارت کی وجہ سے گوشہ نشین سے ہو گئے تھے اور صرف جمعرات کو صبح اور شام گھر سے نکلتے تھے ۔ اس سوال پر کہ آخر جمعرات ہی کو باہر جانے کے لیے آپ نے منتخب کیوں کیا ، فرمانے لگے : اس روز میں اپنے بزرگوں ، استادوں ، دوستوں اور عزیزوں سے ملنے کے لیے مختلف قبرستانوں میں چلا جاتا ہوں ۔ وہاں سے کچھ لانے کے لیے نہیں بلکہ کچھ دینے کے لیے جاتا ہوں ، اور

یہ ہدیۂ دعا ہے جو میں بڑے خلوص سے ان کی مغفرت کے لیے حضورِ حق میں پیش کرتا ہوں اور پھر زندگی کے اس حصے پر پہنچ چکا ہوں کہ معلوم نہیں کب کوئی موج آئے اور مجھے بہا کر لے جائے ، اس لیے اس دیار سے اپنے آپ کو مانوس کر رہا ہوں ۔ ذرا سے توقف کے بعد فرمانے لگے : تیس برس سے اوپر ملازمت کی ہے اور ایسی جگہ زندگی بسر کی ہے جو تہذیب و تمدن کی ترقی سے محروم تھا ۔ انھوں نے بتایا کہ یہ ان کی دقت پسند طبیعت کا تقاضا تھا جو انھیں گلگت ایسے دور دراز مقام پر ملازمت قبول کرنے کے لیے لے گیا ۔ عرض کی کہ اس دور دراز علاقے میں جو ترقی یافتہ علاقوں سے کٹا ہوا تھا آپ نے کوئی ادبی ماحول پیدا کر لیا ہوگا جس سے آپ کے ذوق کی تسکین بھی ہوتی اور زندگی اطمینان سے گزر جاتی ۔ اس کا جواب انھوں نے یہ دیا : میری انفرادیت نے مجھے اس تنہائی کو محسوس نہیں ہونے دیا اور نہ میں نے کوئی ادبی حلقہ بنایا کیونکہ اس کا کوئی امکان ہی نہ تھا ۔ گلگت ایسے دور افتادہ مقام میں ادبی ذوق رکھنے والے تھے ہی کہاں ؟ میں گلگت کی تنہائیوں میں اشعار کہتا رہا جو ہندوستان کے رسالوں میں چھپتے رہے ۔ نغمہ سرائی ہی ایک واحد شغل تھا جس کے فیض سے کنجِ تنہائی میں وقت اچھا گزر گیا ۔

''گلبانگِ حیات'' کی بات چھڑی تو آپ نے بڑے دکھ کے ساتھ اس بات کا اظہار کیا کہ نقادوں نے انھیں سمجھا ہی نہیں ۔ ان کے فن کے بارے میں جس نے بھی لکھا انھیں علامہ اقبال کا مقلد اور ان کی شاہراہ پر چلنے والا شاعر کہا ، حالانکہ یہ بات نہیں ۔ ان کے دل میں علامہ اقبال کا جتنا احترام ہے اور ان کے کلام کی جتنی قدر ہے وہ کم لوگوں کے حصہ میں آئی ہوگی ۔ اس احترام و عقیدت کے باوجود ان کا مسلک الگ ہے اور راستہ بھی جدا ۔ وہ ایقان کے نظریے کے قائل ہیں اور علامہ اقبال خودی کے مبلغ ہیں ۔ انھوں نے فرمایا کہ ایک بار علامہ مرحوم سے ان دونوں نظریوں پر ان کی بحث ہوئی تو علامہ نے نظریۂ ایقان کو خودی سے بلند بتایا ۔ انھیں افسوس تھا کہ ان کی یہ تصنیف جو اردو ادب میں ایک خاص مقام کی مستحق ہے اس توجہ سے نہیں دیکھی گئی جس کا وہ تقاضا کرتی تھی ۔ امین حزیں کے نظریۂ ایقان کے متعلق ''گلبانگِ حیات'' کے دیباچے میں شیخ عبدالقادر مرحوم نے بھی اشارہ کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

''گزشتہ جنگِ عظیم میں قوموں کا بننا اور بگڑنا دیکھ کر امین کے دل میں یہ خیال مستحکم ہوگیا کہ جو قومیں بڑھتی ہیں وہ اس لیے بڑھتی ہیں کہ ان کا یقین اپنے متعلق مضبوط ہوتا ہے اور وہ سمجھتی ہیں کہ جو ارادہ وہ

کر لیں گی ، ہمت اور محنت اسے پورا کر سکتی ہے اور جن قوموں کا 'یقین' کمزور اور ناقص ہے ان کے کام بھی ادھورے اور نامکمل ہیں اور یہی اصول افراد پر حاوی ہے ، کیونکہ قومیں افراد کا مجموعہ ہیں ۔ اس نظریے کو سامنے رکھ کر امین نے ۱۹۲۴ء میں فارسی ادبیات میں قطعات لکھے اور ان کے مجموعے کا نام 'نوائے دل' تجویز کیا ۔ اس کے مسودات وقتاً فوقتاً فارسی کے مشہور استادِ غزل مولانا گرامی مرحوم کے پاس بھیجے گئے ۔ انھوں نے اپنی پسندیدگی کا اظہار متعدد خطوط میں کیا ۔ افسوس ہے کہ گرامی کی تعریف اور نیاز فتح پوری کی تائید کے باوجود یہ قطعات ابھی تک شائع نہیں ہوئے ۔ مگر میں نے ان کا ذکر یہاں اس لیے ضروری سمجھا ہے کہ یہ قطعات اس شاعری کی اساس ہیں جو اس اُردو مجموعہ میں موجود ہے جو اب شائع ہو رہا ہے اور جس کا نام 'گلبانگِ حیات' رکھا گیا ہے ۔"

"تذکرہ شعرائے پنجاب فارسی" مرتبہ خواجہ عبدالرشید صاحب میں بھی امین حزیں صاحب کے نظریۂ ایقان کا ذکر ہے جو ان الفاظ میں ہے : "اقبال عقیدہ داشت کہ خودی سرمایۂ زندگی است اما حزیں 'ایقان' را منتہائے زندگی می داند :

اگر زیر فلک 'ایقان' نبودی بشر بودی ولی انسان نبودی"

متذکرہ ملاقات میں میرے اس سوال پر کہ "گلبانگِ حیات" کے بعد کوئی دوسرا مجموعۂ کلام اب تک منصۂ شہود پر کیوں نہ آیا ، بڑے دکھ کے ساتھ فرمانے لگے کہ ان کے سات مجموعے تیار پڑے ہیں لیکن ناشروں کی بے اصولی سے وہ اب تک شائع نہ ہو سکے ۔

ایک ایسی شخصیت کے روبرو بیٹھنا جنھوں نے علامہ میر حسن سیالکوٹی سے فیض حاصل کیا تھا اور علامہ اقبال کے ہم وطن اور ہم نشیں تھے میرے لیے وجۂ مسرت اور سرمایۂ فخر تھا ۔ اُنھوں نے اپنے فارسی قطعات ، جو اُنھوں نے "نوائے دل" کے عنوان سے کہے تھے اور جو اقبال کو نذر کیے ہوئے تھے ، دکھائے ۔ ان قطعات کے شروع میں قطعات کا تعارف ہے جس میں گرامی مرحوم اور علامہ اقبال کے مکتوبات بھی نقل کیے ہوئے ہیں ۔ ان دونوں بزرگوں نے قطعات کی بڑی تعریف کی ہے ۔ ان کے یہ قطعات کچھ تو شائع ہو چکے ہیں اور کچھ غیر مطبوعہ پڑے ہوئے ہیں ۔ جن اشعار میں یہ ہدیہ پیش کیا گیا ہے وہ بہت اُونچے درجے کے شعر ہیں جنھیں دیکھ کر علامہ اقبال نے ان کا شکریہ ادا کیا تھا ۔

امین حزیں صاحب نے اپنے موجودہ مشاغل کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:
تھوڑا بہت لکھ پڑھ لیتا ہوں ۔ کچھ وقت یادِ حق میں گزر جاتا ہے ۔ کہیں آنا ہے ، نہ کہیں جانا ۔ البتہ ایک پروگرام ابھی تک جاری ہے اور وہ غور و تجسس کا پروگرام ہے ۔ قرآنِ حکیم کی تلاوت کے وقت نکات ذہن میں پیدا ہوتے ہیں ، قلم برداشتہ لکھتا چلا جاتا ہوں ۔ خدا کا شکر ہے کہ ذہن مصروف رہتا ہے ورنہ باقی اعضا مضمحل ہو گئے ہیں ۔ جو وقت میسر آتا ہے اس میں جس قدر لکھ سکتا ہوں لکھے جاتا ہوں ۔ چنانچہ تفسیاتِ قرآن پر مضامین کا سلسلہ شروع کیا ہوا ہے جو ماہ نامہ ''ساقی'' (کراچی) میں چھپتا ہے ۔ شعر و سخن میری زندگی ہے اور یہی میری زندگی کا مقصدِ اولیٰ ہے ۔

فرمانے لگے : میں نے شاعری کے تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے ۔ میں نے کبھی کسی کی تقلید نہیں کی ۔ علامہ اقبالؒ سے میں متاثر ضرور ہوں لیکن میری شاعری کا رنگ اور پیام علامہ کے کلام سے مختلف ہے ۔

میری درخواست پر اُنھوں نے اپنا تازہ کلام بھی سنایا ۔ اُنھیں پڑھنے میں دقت محسوس ہو رہی تھی اور اُنھوں نے چاہا کہ میں خود پڑھ لوں ، لیکن میرے اس شوق کے سامنے کہ وہ خود اپنی زبان سے عطا فرمائیں ، اُنھوں نے کئی غزلیں ، نظمیں ، قطعات اور ہندی کے گیت سنائے ۔ اس کے بعد بیاض اُنھوں نے میری طرف بڑھا دی اور میں نے خود دو چار غزلیں پڑھیں اور محسوس کیا کہ ان کا کلام پاکیزگی اور بلند خیالی کا نادر مجموعہ ہے ۔ ساتھ ساتھ چائے کا دور بھی چلتا رہا اور وہ بضد ہو کر کھلاتے اور پلاتے رہے ۔

امین حزیں بڑے وضع دار بزرگ تھے ۔ زندگی کے لیے جو راہیں متعین کر لی تھیں ان پر چلتے رہتے تھے ۔ اپنی شاعری کے پراپیگنڈہ کے لیے وہ کسی ادارے کے کبھی قائل ہوئے ، نہ کوئی حلقہ بنایا ۔ وہ خاموشی سے کام کیے جانا پسند کرتے تھے اور اُنھیں اطمینان تھا کہ وہ خلوص و صداقت سے ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں ۔

شام ہو رہی تھی ۔ رخصت کی اجازت چاہی ، لیکن اُٹھتے اُٹھتے بھی کارخانۂ حیات میں جو یک رنگی ہے اس پر اظہارِ خیال فرمایا اور پانسات منٹوں میں خدا ، مظاہرِ قدرت اور حیات کے متعلق اتنا جامع خطبہ ارشاد فرمایا جس سے ان کی وسیع معلومات کا بخوبی پتا چلتا تھا ۔

رخصت ہوتے وقت جب مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو فرمایا : بھئی ، میرا اسلام میرے پینتیس برسوں کی مسلسل چھان بین اور گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہے ۔

مذہب و عقاید کے ایک ایک نقطہ پر غور کیا ہے جب کہیں یہ پختگی آئی ہے۔ یہی نہیں سائنس کے مختلف شعبوں کا بھی مطالعہ شغلِ زندگی رہا۔

اس بات کا افسوس ہے کہ ان سے پھر ملاقات کا موقع نہ ملا۔ ۱۹۶۳ میں اثر صہبائی مرحوم کے جنازے کے ساتھ ان کو دیکھا تو پیری پوری طرح غلبہ پا چکی تھی اور دو آدمیوں کے سہارے سے چل رہے تھے۔ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا کہ وہ شخص جو کچھ عرصہ پہلے وجاہت اور تاب و تواں کا مالک تھا بڑھاپے نے اسے اتنا لاچار کر دیا کہ خود چل بھی نہیں سکتا۔ سچ ہے زمانہ ایک جیسا نہیں رہتا۔ پھول کھلتے ہیں اور مرجھا جاتے ہیں۔ جسمانی طور پر وہ معذور ہی سہی لیکن ان کی شاعری میں سدا بہار پھولوں کے انبار لگے ہیں جن کی نکہتوں میں کبھی کمی نہیں آئے گی۔

امین حزیں اُردو اور فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ اُنھوں نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی شعرگوئی محض شعر کہنے کے لیے نہیں۔ ان کے پاس کوئی پیغام بھی تھا۔ وہ صاحبِ فکر شاعر تھے اور اُن کے افکار میں علم و حکمت کے موتی، کائنات اور حیاتِ انسانی کے لیے روح افروز پیغامات تھے۔ ان کا فلسفۂ زندگی انسان کو بے عمل زندگی سے روکتا ہے اور سرگرمِ عمل رہنے کا درس دیتا ہے۔ فکر و نظر کی بلندی، دل و نگاہ کی پاکیزگی، اعلیٰ مقاصد کی لگن اور حیاتِ انسانی میں جہدِ مسلسل کی اہمیت ان کے فلسفہ کی اساس ہے۔ ان کا کلام بلند حوصلگی، عالی ظرفی، انسانی اقدار کی نگہداشت کرنا سکھاتا ہے۔ انھیں سکونِ گوشہ نشینی اور طریقِ خانقاہی سخت ناپسند ہے۔ انسانی اقدار کو بلند کرنے کی تڑپ اور بے تابی ان کی شاعری کی روح ہے۔ فرماتے ہیں:

کہتا ہے ذرہ ذرہ یہی کائنات کا
ہنگامۂ حیات ہے مقصد حیات کا

* * *

پرواز کی خلش کو نشیمن نہیں عزیز
دانے جنھیں نمو کا جنوں تھا شجر ہوئے
جو نونہال طالبِ بالیدگی رہے
پھولے وہی چمن میں وہی بار ور ہوئے
کھولی صدف نے جس کے لیے تربیت کی گود
ابرِ بہار کے وہی قطرے گہر ہوئے

جو غنچے شاخ سے رہے پیوستہ اے امیں
اک دن گلِ شگفتہ ہوئے اور ثمر ہوئے

• • •

جانِ حیات ہیں یہی جانِ حیات ہیں
بے تابیاں ہی نام و نشانِ حیات ہیں
بے تابیاں ہی تاب و توانِ حیات ہیں

• • •

عزمِ تسخیر کے جذبات ہوں آنکھوں میں اگر
منحرف تجھ سے کبھی فطرتِ چالاک نہ ہو

• • •

نگاہ کی بلندیاں ہی عرش ہیں شعور کا
نگاہ کی بلندیاں ہی خُم لیے طہور کا
لطیف سی جھلک تھی اِک بلندیٔ نگاہ کی
کلیم کو گماں ہوا تھا جس پہ شمعِ طور کا

ایک عزیز دوست کی وفات پر کہتے ہیں :

زندگی زیرِ فلک بازیٔ طفلانہ نہیں
کارخانہ ہے ، جہاں کوئی طرب خانہ نہیں

مرزا غالب کی طرح انہیں بھی مایوسیوں اور فرہاد کے سر پھوڑ کر مر جانے کی ادا پسند نہیں ۔ کہتے ہیں :

یاس میں پھوڑ کے سر مرتے ہیں کم ظرف امیں
ظرف عالی ہے ترا بیعتِ فرہاد نہ کر

ایک قطعہ میں فرماتے ہیں :

زندگی راہ گزارِ موت نہیں   زندگی خار زارِ موت نہیں
زندگی زندگی ہے سرتاپا   زندگی انتظارِ موت نہیں

آرزوؤں ، بلند نصب العین ، تلاش و جستجو ، جہدِ مسلسل اور زندگی کی امنگوں کے بغیر زندگی بے رونق اور بے معنی ہے ۔ فرماتے ہیں :

دلِ بے مدعا بھی کوئی دل ہے   بغل میں بے شرر پتھر کی سِل ہے

نہیں اُگتا جہاں تخمِ تمنا زمینِ شور ہے بے فیضِ گل ہے

* * *

جنوں ساماں نہ ہو جو آرزو ، وہ آرزو کیسی ؟
نہ ہو روشن مثالِ مہر جو ، وہ مدعا کیسا ؟
نہ ہو جو سعیٔ پیہم سربسر وہ جستجو کیسی ؟
نہ ہو جو رشکِ صد آئینہ وہ صدق و صفا کیسا ؟

امین حزیں "ایقان" کے مبلغ ہی سہی ، لیکن فقر و خودی کو بھی وہ انسانی معراج کے لیے ضروری سمجھتے ہیں ۔ علامہ اقبالؒ بھی ، جن کے متعلق ان کا خیال ہے کہ وہ خودی کے مبلغ ہیں ، انسانی زندگی میں یقین کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کرتے ۔ وہ تو یہاں تک کہتے ہی کہ : ع

آدم بمیرد از بے یقینی

امین حزیں بے خودی کی مزمت کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

شکستِ ہمتِ عالی ہے بے خودی کی تلاش
کہ کارخانہ ہے دنیا شراب خانہ نہیں

* * *

میں بے خودوں کے لیے ہوں پیامِ شوقِ عمل
امیں کے پردے میں تیرا سرود ہوں ساقی

* * *

کلاہِ فقر جب میں نے ازل سے اوڑھ رکھی ہے
امین تو ہی بتا فغفور کی سوگند کیوں کھاؤں

* * *

دریا کے تموّج میں دریا کی خودی پنہاں
گوہر کے تجمل میں قطرے کی خودی نازاں
ہر چیز خودی سے ہے ارضی کہ سماوی ہو
مہر و مہ و انجم میں ہے ان کی خودی تاباں

* * *

بادل کی گرج میں ہے بادل کی خودی مضمر
بجلی کی تڑپ میں ہے بجلی کی خودی مضمر
کہتے ہیں خودی جس کو آئینہ ہے جوہر کا
بن اس کے امیں جوہر رہتا ہی نہیں جوہر

"خودی خدائے خودی کے حضور میں" ان کی ایک نظم ہے جس کے آخری بند میں "خدائے خودی" خودی کے متعلق کہتے ہیں :

خودی وہ جذبۂ بے اختیار ذاتی ہے
ازل سے جس سے حفاظت ہے ذات کی مقصود
غرور کہتے ہیں جس کو خودی کا ہے ہم زاد
مگر وہ لغو سراپا یہ سر بسر محمود
اخوّت اور سلامت روی خودی کا شعار
مثالِ مہرِ جہاں تاب اس کا ذوقِ نمود
خودی نے جس کو نوازا وہ باکمال ہوا
خودی سے قوموں کا اقبال لازوال ہوا

یہ علامہ اقبالؒ کے درسِ خودی کا ہی اثر ہے کہ اس سے اسلامیانِ ہند کا سیاسی شعور اتنا بلند ہوا کہ وہ اپنا الگ وطن بنانے میں کامیاب ہوئے۔ علامہ اقبالؒ نے "اسرارِ خودی" کے دیباچے میں فرمایا کہ "یہ لفظ (خودی) اس نظم میں بہ معنی غرور استعمال نہیں کیا گیا جیسا کہ عام طرر پر اُردو میں مستعمل ہے۔ اس کا مفہوم محض احساسِ نفس یا تعینِ ذات ہے" :

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات ! خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات !

* * *

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے ! نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے !
زمانے کے دھارے میں بہتی ہوئی ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی

* * *

ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر
خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے فلک جس طرح آنکھ کے تِل میں ہے[1]

امین حزیں خودی کے طفیل عرفانِ ذات کا مژدہ دیتے ہوئے کہتے ہیں :

دلیلِ راہ "چراغِ خودی" اگر ہو جائے
قدم مسافرِ ہستی کا تیز تر ہو جائے

۱- "بالِ جبریل"، ص ۱۷۲ - ۱۷۳ -

مقامِ عالیٔ عرفانِ ذات ہے یعنی
خودی یہی ہے کہ تجھ کو تری خبر ہو جائے

٭ ٭ ٭

خودی کو کہتے ہیں دل کے جذبات بہتریں کی امیں نمائش
غرور کا اس ''مقامِ محمود'' زندگی میں گزر کہاں ہے

اور اسی خودی کے طفیل :

حاکموں سے ہوں بے نیاز امیں ہے مزاجِ فقیر شاہانہ

خودی کے ساتھ ساتھ ''نظریۂ ایقان'' کی وہ اپنے کلام میں جگہ بہ جگہ تبلیغ کرتے ہیں ۔ فرماتے ہیں :

وہ جن میں نورِ شعور وجدان نہیں ہے مٹی کی مورتیں ہیں
نگاہِ فطرت میں دل نہیں ہے وہ دل کہ جس میں یقیں نہیں ہے

٭ ٭ ٭

چیز ایسی ہی کوئی رندوں کے پیمانہ میں ہو
جس سے سرشار یقیں ہو جو بھی میخانہ میں ہو

امین حزیں تقدیر کی تحریروں پر شاکر رہنے والوں کو بے عمل سمجھتے ہیں جو ہاتھ پیر توڑ کر اس خیال پر بیٹھے رہیں کہ : ''شاید کوئی لطیفۂ غیبی ہو آشکار''۔ وہ ایسے لوگوں کے دل میں عمل کی شمع جلا کر سرگرمِ کار دیکھنا چاہتے ہیں ۔ فرماتے ہیں :

فلک کو کوستے ہیں نالۂ شب گیر کرتے ہیں
جو پاداشِ عمل پر شکوۂ تقدیر کرتے ہیں
مکافاتِ عمل کا مسئلہ مشکل نہیں اتنا
یہ جنت ہو کہ دوزخ خود ہمیں تعمیر کرتے ہیں

٭ ٭ ٭

بے خبر ! نوعِ بشر بستۂ تقدیر نہیں
طوق گردن میں کوئی پاؤں میں زنجیر نہیں

سعی و کوشش سے امیں ہو نہیں سکتا کیا کچھ
خود ترا دل ہی مگر خوگرِ تدبیر نہیں

* * *

بے خبر ! نوعِ بشر بستۂ تقدیر نہیں
کوئی پیشانی پہ لکھی ہوئی تحریر نہیں
گر گیا آپ ہی جو اپنی نظر سے انسان
اس کی دنیا کے کسی گوشے میں توقیر نہیں

* * *

بے خبر ! نوعِ بشر بستۂ تقدیر نہیں
زندگی ''فرصتِ اعمال'' ہے تعزیر نہیں
زینتِ دوشِ ازل سے ہے ترا دامِ خودی
دشتِ ہستی میں تو صیاد ہے نخچیر نہیں

ایک اور قطعہ میں کہتے ہیں :

کس وہم میں اُلجھا ہے کہ تقدیر میں کیا ہے
لکھا ہوا تقدیر کا اچھا کہ بُرا ہے ؟
تقدیر کا قائل ہے تو اے بندۂ تقدیر !
تیرے لیے بس مسلکِ تسلیم و رضا ہے

وہ خانقاہوں کے بے عمل صوفی سے بھی ناراض ہیں اور کہتے ہیں :

ہستی کو حجاب کہہ رہا ہے موجود کو خواب کہہ رہا ہے
صوفی کو نگاہ دے الٰہی قلزم کو سراب کہہ رہا ہے

انسانی اقدار کی حفاظت اور انسان دوستی کی عظمت جتاتے ہوئے فرماتے ہیں :

جو ماہ و خورشید بن کے چمکے ہے چشمۂ فیض وہ جوان
ہو درد سارے جہاں کا جس میں شباب وہ فخرِ انس و جان ہے
خودی کے اثباتِ روح پرور کو بت بنا کر جو پوجتا ہے
حریمِ ہستی قوم کا وہ جوان ہی محافظ ہے پاسبان ہے

وہ انسان میں کن اوصاف کو دیکھنا چاہتے ہیں ؟ احوال و مقامات کے

زیرِ عنوان ایک نظم میں فرماتے ہیں :

کفِ خاک بیباک ہو دیدہ ور ہو
خود آگاہ ہو خود گر و خود نگر ہو
زمیں پر قدم آسماں پر نظر ہو
کہ لاریب منشائے فطرت یہی ہے

یہی خاکیوں کی ہے معراجِ عرفاں
اسی سے حقیقت میں ہے شانِ انساں
امیں خدمتِ خلق ہے اصلِ ایماں
قسم ہے خدا کی شریعت یہی ہے

* * *

امیں جو وقف ہو بہبودِ خلق ہی کے لیے
خوشا وہ دردِ نہاں ! اور زہے وہ سوزِ نہاں !

وہ انسانی سربلندی کے لیے ہر دم کوشاں رہتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ انسانی اقدار کا دامن داغ دار ہو ۔ وہ اس گوہرِ بے بہا کی حفاظت کی تلقین تو اکثر کرتے رہتے ہیں ، لیکن کبھی کبھی انتباہ سے بھی کام لیتے ہیں ۔ فرماتے ہیں :

جھک گیا جو اور بھی اس کو جھکایا جائے گا
دیدہ و دانستہ نظروں سے گرایا جائے گا
نقش جو کوشاں نہیں خود ہی ابھرنے کے لیے
آپ مٹ جائے گا یا اس کو مٹایا جائے گا

* * *

وہ خاک خاک ہی رہتی ہے حشر تک ناداں !
خلوصِ دل سے جو کوشاں نہ ہو بقا کے لیے

علامہ اقبال سے ان کی عقیدت اور نیاز مندی ڈھکی چھپی بات نہیں ۔ دونوں ہم وطن تھے ۔ دونوں نے ایک فاضلِ یگانہ سے کسبِ فیض کیا تھا ۔ جب تک علامہ زندہ رہے ان کی مجلسوں میں بیٹھتے اٹھتے رہے اور محبت کے رشتے قائم رہے ۔

علامہ کا رنگِ سخن بہت سے شاعروں نے اختیار کیا لیکن کسی میں وہ بات پیدا نہ ہوئی جو علامہ کے اسلوب کی خصوصیت تھی ۔ البتہ امین حزیں اس اعتبار سے بڑے کامیاب ہیں کہ ان کا کلام کچھ اپنے اور کچھ علامہ اقبال کے مفکرانہ انداز سے دل پذیر ہوگیا ۔ اگر ایک شاعر اپنے عہد کے یا اپنے سے ما قبل دور کے شاعر سے متاثر ہوتا ہے تو یہ کوئی الزام نہیں اور نہ اس میں کوئی

برائی ہے۔ علامہ اقبال خود غالب کے فلسفیانہ انداز سے بڑے متاثر تھے اور غالب بیدل سے لیکن اس سے اقبال یا غالب کے کمال پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اسی طرح اگر امین حزیں علامہ اقبال کے اندازِ سخن اور ان کی فلسفیانہ شاعری سے متاثر ہوئے تو اس سے امین حزیں کا منصب کسی طرح کم نہیں ہو جاتا۔

شیخ عبدالقادر نے، جو "گلبانگِ حیات" کے دیباچہ نگار ہیں، اس سلسلے میں لکھا ہے:

''امین کو اپنی موزونیٔ طبع کا احساس تو زمانۂ طالب علمی ہی میں ہوگیا تھا اور کبھی کبھی اُردو غزل لکھتے تھے۔ ۱۹۰۲ میں ان کی ایک غزل لکھنو کے 'پیامِ یار' میں چھپی اور پسند کی گئی۔ اس وقت ان کو خیال ہوا کہ اقبال کی شاگردی کریں۔ ان سے ملے اور اپنے ارادے کا اظہار کیا۔ اُنھوں نے کہا 'شاعری خداداد چیز ہے۔ اگر شعر گوئی کا جذبہ سچا ہے تو مشقِ سخن کیے جائیے اور اساتذہ کا کلام بغور پڑھیے تاکہ کان بحروں سے مانوس ہو جائیں اور زبان میں کوئی سقم باقی نہ رہے'۔ اس دن سے امین اس مشورہ پر عامل ہیں۔ ابتدا میں مولوی ظفر علی خان اور مولانا محمد علی مرحوم کے رنگ سے متاثر تھے لیکن بعد ازاں ان کی طبیعت پر اقبال کا رنگ چھا گیا۔''

اس کے باوجود امین حزیں نے بعد میں اپنے لیے اقلیمِ سخن میں نئی راہیں بھی تلاش کیں اور نئے افکار سے بھی اپنے اشعار کو مزین کیا، جس سے ان کے شاعرانہ کمال اور نام وری میں اور بھی اضافہ ہوا۔ علامہ اقبال کی وفات کے کچھ دنوں بعد یعنی ۱۲ مئی ۱۹۳۸ کو امین حزیں صاحب نے علامہ کی یاد میں ایک درد انگیز نوحے میں اپنے دکھ درد اور اپنی عقیدت مندی کا اظہار ایسے موثر انداز میں کیا ہے کہ پڑھ کر آنکھیں نم ہو جاتی ہیں:

مئے باقی کا جام تھے اقبال
زندگی کا پیام تھے اقبال
مومنوں کے امام تھے اقبال

ہائے کیا چیز چھن گئی ہم سے

قلزمِ علم کے شناور تھے
حکمتِ نادرہ کے دفتر تھے
ان کے جوہر عجیب جوہر تھے

ہائے کیا چیز چھن گئی ہم سے

ہند میں ایک ہی مسلماں تھے
اہلِ مشرق کے مہرِ تاباں تھے
یعنی دانائے رازِ انساں تھے
ہائے کیا چیز چھن گئی ہم سے

قوم کیوں آج بے قرار نہ ہو
قوم کیوں آج اشک بار نہ ہو
قوم کیوں آج سوگوار نہ ہو
ہائے کیا چیز چھن گئی ہم سے

"پیرِ ہندی'' ترا نیاز آگیں
تیرا شیدا ترا امینِ حزیں
نوحہ گر کیوں نہ ہو بصدق و یقیں
ہائے کیا چیز چھن گئی ہم سے

رحمتِ ذوالجلال تھے اقبال
آپ اپنی مثال تھے اقبال

''تربتِ پیرِ ہندی'' کے عنوان سے ان کی ایک مختصر سی نظم ہے جس میں علامہ اقبالؒ کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

جبیں میری نگاہیں ہو رہی ہیں — دعائیں سرد آہیں ہو رہی ہیں
عقیدت کا چڑھاوا چڑھ رہا ہے — غلافِ قبر باہیں ہو رہی ہیں

* * *

لحد میں مردِ مومن سو رہا ہے — نزولِ رحمتِ حق ہو رہا ہے
عقیدت پیرِ ہندی سے ہے کتنی — کہ جو زائر ہے دل سے رو رہا ہے

* * *

میں کس درد آشنا کی قبر پر ہوں — کہ محوِ لذتِ دردِ جگر ہوں
نئے عالم کے نظاروں میں گم ہوں — الٰہی میں بھی کیا اہلِ نظر ہوں

* * *

کھنچا ہے گردِ تربت حلقۂ نور — یہی موسیٰ منش مردوں کا ہے طور
بزرگوں کی زیارت کر رہا ہوں — وہ رومی ہیں وہ افغانی وہ منصور

امین حزیں نے اپنے افکار کے اظہار کے لیے نظم و قطعات و مثنوی کی اصناف کو زیادہ استعمال کیا ہے۔ انھوں نے غزلیں بھی کہیں اور ان میں بھی ان کا مخصوص رنگ جھلکتا ہے۔ وہی متفکرانہ انداز، بلندیٔ نظر و پاکیزگی

ہے جو ان کی نظموں اور قطعات میں ہے۔ تغزل کی چاشنی بھی ضرور ہے لیکن ان کے مفکرانہ انداز کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہے۔ غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں :

دل میں جذبات کا طوفاں بپا ہو جانا
کوئی کیا جانے کہ یہ ہوتا ہے کیا ہو جانا

آرزو کا دلِ خود کام میں پیدا ہونا
ناخنِ عقل کا پھر عقدہ کشا ہو جانا

قطرۂ بادۂ سرجوشِ تمنا پینا
خضرِ تائید کا خود راہ نما ہو جانا

چشمِ اُمید کا مستانہ ادا سے کھلنا
عقدۂ ہستیٔ موہوم کا وا ہو جانا

دستِ بے باک میں شمشیرِ عمل کا لینا
سعیٔ پیہم سے شہِ ارض و سما ہو جانا

موج کی شان ہے طوفاں کے بپا رہنے میں
زندگی کیا ہے گرفتارِ بلا ہو جانا

یہ مرا سوز ہی خود ساز ہے اور اس کا ثبوت
نفسِ گرم! ترا موجِ صبا ہو جانا

گرم ہے شعلۂ تفریق سے ہنگامۂ زیست
کوئی کیا جانے ہے کیا ما و شما ہو جانا

• • •

تفکّرات کی دنیا میں جستجوئے سکوں
علاج جس کا نہیں کوئی ہے یہی وہ جنوں

• • •

نہ دے اس آگ کو نارِ خلیل سے نسبت
کہ جس کے سوز میں گلزارِ جاودانہ نہیں

• • •

تھی یہ کس کی آرزو جس کے لیے تارکِ صد آرزو ہونا پڑا

• • •

خود پردہ ہے وجودِ پسِ پردہ کی دلیل
اور آئینہ سراغ ہے آئینہ ساز کا

• • •

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved 2002-2006

ابتدا کی نہ اِنتہا کی خبر قصۂ نا تمام نے مارا

* * *

وہی اس بزمِ ہستی میں سرور اندوز ہوتے ہیں
نگاہیں جن کی ہوں بے باک اور اطوار مردانہ

* * *

جن نگاہوں میں ہے سرورِ جہاں ہیچ ہے ان کے آگے میخانہ

* * *

دل کی بیتابیوں کے عالم کا زندگی نام رکھ دیا کس نے

* * *

اک برق ہے ہجومِ تقاضا لیے ہوئے
جانے میں آ گیا ہوں یہاں کیا لیے ہوئے
اِک تو کہ بے حجاب نہ ہونا تری ادا
اِک میں کہ تیرے شوق کی دنیا لیے ہوئے
اِک تو کہ اپنے حسن کی ہے آپ ہی دلیل
اِک میں کہ تیرے عشق کا دعویٰ لیے ہوئے

* * *

بزمِ ہستی میں رہا زمزمۂ زیست بلب
رزمِ ہستی میں امیں سینہ سپر ہوکے رہا

* * *

حسنِ فطرت کا تماشا ہیں مرے صوم و صلوٰۃ
دل کی حیرت کو مناجات کہا کرتا ہوں

* * *

خالی ہے صدف گہر نہیں ہے ہے آنکھ مگر نظر نہیں ہے

امین حزیں کی زندگی کی تینتیس بہاریں کشمیر اور گلگت کی گل بیز و گل ریز وادیوں میں بسر ہوئی تھیں ، فطرت کے دلآویز مناظر ہر وقت اُن کے سامنے رہے تھے اور وہ اُن سے لطف اندوز بھی ہوتے رہے تھے ۔ اس لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ رنگین نظاروں کی عکاسی نہ کرتے ۔ ان کی بہت سی نظمیں ہیں جن میں اُنھوں نے حسین مناظر کی اس انداز سے تصویرکشی کی ہے کہ اصل منظر سامنے آ جاتا ہے ۔ ذیل میں ان مناظر پر ان کی تین نظمیں ''کشمیر کی صبحِ بہار''،

"کوہستانِ قراقرم کی ایک وادی" اور "حسن کی رُت" داد طلب ہیں ۔ حق تو یہ ہے کہ ایسی منظر نگاری کا حق وہی ادا کر سکتا تھا جس کی زندگی مناظر کی آغوش میں گزری ہو ۔

کشمیر کی صبحِ بہار

جلوۂ نورِ سحر سے طور ہے کوہ و دمن
وادیٔ سینا میں پھولوں کی جمی تھی انجمن

حسنِ رنگینِ گلستاں پر نچھاور کے لیے
بن رہے تھے ڈوب کر تارے ہی خود دُرِ عدن

اُگتے سورج کی شعاعوں سے نکھر جانے کو تھی
ڈالیوں کی نازک اندامی ، گلوں کا بانکپن

اُڑ کے مشرق کی شفق کلیوں کا غازہ بن گئی
جب شعاعِ مہر نے اک ایک کا چوما دہن

آبجو کے آئینے میں عکسِ رنگینِ بہار
دیدۂ نظارہ جو کو تھا چمن اندر چمن

تال سم جھرنوں کا ، پتوں پر ادھر پُروا کی تھاپ
جھوم جھوم اُٹھے عجب انداز سے سرو و سمن

طائروں کے لحنِ داؤدی سے بہتا تھا سرود
جس طرح برسات میں ہوں موجزن گنگ و جمن

اُٹھ گئی جس سمت بھی بیتابِ نظارہ نگہ
شعلہ رو ہی شعلہ رو تھے ، گلبدن ہی گلبدن

ندی ندی کوثر و تسنیم کا گویا جواب
خلد کا بہتا ہوا خم خانۂ شہد و لبن

چلتے پھرتے حسن کی کثرت پہ ہوتا تھا گماں
وادیٔ کشمیر ہے پریوں کا ، حوروں کا وطن

جب بھی آ جاتی ہے اس جنت نشاں خطے کی یاد
شعلہ بن جاتی ہے سینے میں امیں جی کی جلن

دل سے اُٹھی ہے دعا با چشمِ تر سوئے فلک
کاش پھر کشمیر کے سبزے پہ ہم ہوں خیمہ زن

کوہستانِ قراقرم کی ایک وادی

ادھر اُدھر پہاڑ ہیں
جو خشک ہیں اُجاڑ ہیں
نہ گھاس ہی ہری ہری
نہ جھاڑیاں بھری بھری
درخت نام کو نہیں!
کہ سنگلاخ ہے زمیں
جو آندھیوں کا زور ہے
تو پانیوں کا شور ہے
کہیں کہیں ہیں جھونپڑے
ذلیل سے بنے ہوئے
مکیں غریب سب کے سب
یہ زندگی! غضب غضب!
شفق نہیں! سحر نہیں!
کسی کو بھی خبر نہیں!
نہ جلوۂ ریز مہر ہے!
نہ چاندنی کا سحر ہے!
نہ وسعتِ فلک یہاں
نہ ماہ کی جھلک یہاں!
نہ جلوۂ ہلال ہے
نہ کہکشاں کا جال ہے
ستارے خال خال ہیں!
سو وہ بھی پُر ملال ہیں!
نظر رکی رکی ہوئی!
پلک جھکی جھکی ہوئی!
جو ابر برف بار ہے
تو باد ناگوار ہے!
رگوں میں جم گیا لہو!
کہ یخ ہی یخ ہے چار سو
امیں کی ہے یہی دعا!
نہ لائے پھر یہاں خدا!

حُسن کی رُت

ابر کے پردے میں تھے کوثر و تسنیم نہاں
دھول اُڑتی تھی جہاں منظرِ جنت ہے وہاں
دھل گئے دامنِ گلشن پہ تھے جو داغِ خزاں
سبزہ بیدار ہے باراں کی مسیحائی سے
غنچے کچھ کہنے کو ہیں عاشقِ ہرجائی سے

نونہالانِ چمن جھوم رہے ہیں ہر سُو
غنچے ایک ایک کا منہ چوم رہے ہیں ہر سُو
سرو مستوں کی طرح گھوم رہے ہیں ہر سُو
خود اثر کہتا ہے گلشن میں ہے کیا گردش میں؟
ساغرِ مے ہے، نہیں بادِ صبا گردش میں

پتے پتے سے ترنم کی صدا آتی ہے
گوشے گوشے میں کوئی حور چھپی گاتی ہے
نور کا تڑکا ہے نظارہ طلسماتی ہے
سحرِ نغمہ سے مسرت کا جنوں ہے پیدا
روحِ بیتاب کے سینے میں سکوں ہے پیدا

حسن کی رت ہے ہر اک ذرہ میں رعنائی ہے
خود نمائی ہے ، خود آرائی ہے ، خود رائی ہے
کثرتِ جلوہ ہے ، اور چشم تماشائی ہے
اک جہاں حسن میں ڈوبا ہے نگاہوں کے لیے
آج فرصت دلِ محزوں نہیں آہوں کے لیے

''وداع'' ان کی تاثیر میں ڈوبی ہوئی ایک ایسی نظم ہے جو انھوں نے ملازمت کے تینتیس سال گزار کر کشمیر اور اہلِ کشمیر سے رخصت ہوتے وقت کہی ۔ ملاحظہ ہو :

رخصت ہندو کش کے پہاڑو ! رخصت اے دلچسپ اُجاڑو !
رخصت ننگا[1] کے نظارے قدرت کے نادر شہ پارے
رخصت اے ذی شان دمانی[2] منظر جس کا ہے لاثانی
رخصت اے برفانی تالو[3] رخصت دودھ کے ندی نالو
تم تھے میرے طور اور سینا
میں حق کے جلووں کا جویا

قلب و نظر بیدار ہوئے ہیں جلووں سے سرشار ہوئے ہیں
شوق مرا پائندہ نکلا جوئندہ یابندہ نکلا
بیس اور تیرہ سالِ محرم جاتا ہے بادیدۂ پُر نم
وادی کے باشندو رخصت سرکاری کارندو رخصت
رخصت تم سے ، شاد رہو تم
شاد رہو ، آباد رہو تم

۱۔ ننگا پربت : سطح سمندر سے ۲۶۶۲۰ فٹ بلند پہاڑ ۔
۲۔ دمانی یا رکھا پوشی : سطح سمندر سے ۲۵۵۵۰ فٹ بلند پہاڑ ۔
۳۔ تال ۔ تالاب ۔ جھیل ۔

جہاں زندگی کا بہترین حصہ گزرا ہو ، جہاں کے بلند پہاڑوں ، خوبصورت وادیوں اور خوش خرام ندی نالوں سے انس پیدا ہو گیا ہو وہاں سے رخصت ہوتے ہوئے جذبات میں تلاطم پیدا ہونا قدرتی بات تھی۔ یہ نظم ایسے ہی تاثرات کا آئینہ ہے ۔ ملازمت سے سبک دوش ہو کر سیالکوٹ آ گئے اور ہمہ تن علم و ادب کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا ۔ جب تک تاب و تواں نے ساتھ دیا نغمہ سرا رہے ، یہاں تک کہ قویٰ اور بصارت کے ضعف نے بھی اُنھیں خدمتِ ادب کے فرض سے باز نہ رکھا ۔

امین حزیں کشمیر ہی کے نہیں ، ہند و پاک کے نامور شعرا میں بھی ان کا مقام متعین ہے ۔ آدھی صدی سے ان کے افکار ہند و پاک کے رسالوں اور اخباروں میں چھپتے رہے — زیادہ امین حزیں کے نام سے اور کبھی کبھی ''درویشِ کافر جامہ'' کے قلمی نام سے ۔ بالآخر یہ مفکر شاعر چونسٹھ برس ادب کی خدمت کر کے ۱۴ اگست ۱۹۶۸ کو وفات پا گئے ۔